https://telegram.me/ilmokitab

پروفیسر یوسف سلیم چشتی

پروفیسر صاحب کے نام سے میں اس وقت آشنا ہوا جب میں نے کالج میں داخلہ لیا اور کلامِ اقبال سے شناسائی ہوئی۔ کلامِ اقبال میرے لیے چیستاں کے مانند تھا، عقدہ کشائی کے لیے پروفیسر یوسف سلیم چشتی کی تیار کردہ شرحوں کا سہارا لیا اور حسبِ توفیق و استطاعت مزید گم راہ ہوا۔ ان شرحوں میں کلامِ اقبال کے مفاہیم و معانی چشتی صاحب کے پھیلائے علمی غبار میں گم ہو چکے تھے۔ چشتی صاحب کا علم و فضل دریا کی موج کے مانند تھا، جسے کشتی کسی کی پار لگنے یا درمیان رہنے سے واسطہ نہ تھا۔

۲۱ر اپریل ۱۹۶۵ء کو چشتی صاحب اقبال اکادمی کے زیرِ اہتمام یومِ اقبال میں شرکت کے لیے کراچی تشریف لائے۔ اس زمانے میں سرکاری سرپرستی میں یومِ اقبال عرب کے میلۂ عکاظ کے مانند بڑے اہتمام سے منایا جاتا۔ دور و نزدیک سے اقبال شناس دانش ور بلائے جاتے۔ جب سامعین اور مقررین پے در پے مقالات کی ضرباتِ شدید سے نڈھال ہو جاتے تو وقفہ کیا جاتا اور انھیں کھانے کی دعوت دے کر اوسان بحال کرنے کی اجازت دی جاتی۔ جب مقالات پڑھے جاتے تو یہ وقت اونگھنے کی نذر ہوتا لیکن کھانے کی دعوت ملتے ہی نیند غائب ہو جاتی اور اقبال دوستی بیدار ہو جاتی اور میں بھی دیگر حاضرین کی طرح میدانِ ماکولات و مشروبات میں بھرپور دادِ شجاعت دیتا۔ برسوں یومِ اقبال

منانے کی روایت رخشندہ و تابندہ رہی لیکن بعد میں اقبال اکادمی کے لاہور منتقل ہو جانے اور حکمرانوں کی ترجیحات بدل جانے کی بنا پر اقبال شناسی کی روایت اور اس سے وابستہ دعوتیں قصۂ پارینہ ہوگئیں۔

اپریل ۱۹۶۵ء میں، میں کراچی یونی ورسٹی میں بی اے (آنرز) سال دوم کا طالبِ علم تھا۔ مولانا یوسف سلیم چشتی اس وقت ۷۵ برس کے تھے۔ یومِ اقبال کی تقریب ہوٹل میٹروپول میں منعقد ہوئی۔ مولانا کا مقالہ مغرب کے بعد ختم ہوا۔ تقریب کے بعد مولانا سامعین سے داد سمیٹنے کے بعد عقیدت مندوں کے جھرمٹ میں خوب چہک رہے تھے۔ ہجوم چھٹا تو میں حاضرِ خدمت ہوا۔ نیاز مندی اور اظہارِ عقیدت کے بعد میں نے آپ سے آئندہ ملاقات کی استدعا کی۔ مولانا نے کمالِ شفقت سے اپنا لاہور کا پتا دیا اور آئندہ خط کتابت پر زور دیا۔ اس وقت انھوں نے میری آٹو گراف بک پر اقبال کا مندرجہ ذیل شعر لکھا:

بوعلی اندر غبارِ ناقہ گم
دستِ رومی پردۂ محمل گرفت

کچھ عرصے بعد میں نے انھیں خط لکھا تو جواب قدرے تاخیر سے ملا۔ آپ نے معذرت کے بعد لکھا کہ کراچی سے واپسی کے بعد ان کی طبیعت ناساز رہی اس لیے فوری جواب نہ دے سکے۔ بعد میں ان کے جو خطوط مجھ تک پہنچتے رہے اگر ان کے معالج تک پہنچتے تو اچھا تھا۔ مولانا ان میں اپنی بیماری کی تفصیلات خاصی شرح و بسط سے تحریر فرماتے۔ ان امراض ناموں کو پڑھنے کے بعد میں یہ سوچتا کہ:

کس قیامت کے یہ نامے مرے نام آتے ہیں

مولانا لاہور میں تنہا رہتے تھے اور جورو نہ جاتا اللہ میاں سے ناتا پر عامل تھے۔ ان کے ایک عزیز جن کے مبلغِ علم کی ابتدا اور فروغِ علم کی انتہا مولانا چشتی کی تصانیف تھیں ''عشرت پبلشنگ ہاؤس'' کے نام سے کتابیں شائع کرتے تھے۔ اس ادارے نے مولانا کی بیشتر کتابیں شائع کی تھیں۔ کتابوں کی رائلٹی اور ایک کالج میں پڑھانے کا

معاوضہ ان کے اخراجات کے لیے کافی تھا۔ زندگی بہت سادہ لیکن منضبط تھی اور یہی وجہ تھی کہ بڑھاپے کے باوجود آپ بہت چاق چوبند تھے۔ جوانی میں خوب ورزش کی تھی۔ بڑھاپے میں بھی آپ میلوں پیدل چلتے۔ کالج میں گرمی کی چھٹیاں ہوتے ہی آپ کراچی کے لیے رختِ سفر باندھ لیتے اور کراچی آمد کی اطلاع اپنے نیاز مندوں کو بذریعہ خط دیتے۔ یہاں ان کا قیام اپنے بھائی کے گھر ہوتا۔

مولانا کا قد لمبا نہ تھا بلکہ متوسط سے کچھ دبتا ہوا تھا۔ اکہرا بدن، فراخ ماتھا، تل چاولی داڑھی اور کترواں لب تھے۔ چہرے پر عموماً بشاشت کی کیفیت طاری ہوتی جو ان کے قلبِ مطمئن کی آئینہ دار تھی۔ آپ عموماً قمیص اور کھلے پائنچے کے پاجامے میں ملبوس ہوتے۔ اس پر کبھی موسم کی مناسبت سے شیروانی یا واسکٹ کا اضافہ ہو جاتا۔ لباس سادہ لیکن صاف ستھرا ہوتا۔

میں شام کو حسبِ وعدہ پانچ بجے ان کی قیام گاہ پر جو کینٹ اسٹیشن کے نزدیک تھی، پہنچا تو پہلے ایک خوش وضع باغ اور اس سے ملحق انگریزی اسکول کی ایک عالی شان عمارت دکھائی دی۔ یہاں چوکیداری کے لیے ایک خونخوار کتا تھا۔ شکر ہے کہ لوہے کی مضبوط زنجیر نے کتے کے عزائم کو پست اور میرے حوصلے کو بلند رکھا۔ وہ زبانی طور پر ڈراتا دھمکاتا رہا اور میں جل تو جلال تو، آئی بلا کو ٹال تو کا وظیفہ پڑھ کر اس کے سامنے سے گزر گیا۔

اسکول کی پشت پر چند مکان تھے جن کی خستگی و ویرانی و کہنگی کے آثار دور سے نظر آتے۔ اسکول کی عمارت جس قدر شان دار تھی، یہ مکان اتنے ہی ویران تھے۔ ان میں سے ایک مکان میں مولانا کے بھائی اور ان کا خاندان رہتا تھا۔ میں نے اطلاع کرائی تو مولانا کے ایک بھتیجے نے کرسیاں میدان میں جمائیں اور مجھے انتظار کا سندیسہ دے کر مکان کی وسعت میں غائب ہوا۔ میں منتظر رہا کہ کب مولانا باہر آئیں اور انتظارِ بے کراں سے نجات دلائیں۔

خدا خدا کر کے مولانا پون گھنٹے بعد برآمد ہوئے۔ میں نے شکایت کی تو فرمایا کہ جس وقت آپ آئے تو میں بیت الخلا میں تھا اور مختلف امور پر غور کر رہا تھا۔ اگر میں اس

وقت بیت الخلا نہ جاؤں تو قبض کا شکار ہو جاتا ہوں اور بہت الجھن رہتی ہے۔ بعد میں جب بھی ان کی قیام گاہ پر جانا ہوا تو خود کو مبتلائے انتظار اور انھیں غور وفکر میں گرفتار پایا۔

مولانا نے بتایا کہ انھوں نے شادی نہ کی تھی۔ میں نے وجہ پوچھی تو فرمایا کہ وہ بریلی کے ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم قدیم مدارس میں پائی اور بعد میں جدید تعلیم حاصل کی۔ انھوں نے فلسفے میں بی اے (آنرز) کیا تھا۔ درس و تدریس سے انھیں ابتدا سے شغف تھا۔ جن ساتھی طلبہ کو انھوں نے پڑھایا وہ امتحان میں اعلیٰ نمبروں سے کامیاب ہوئے لیکن خود مولانا کی تھرڈ ڈویژن آئی۔ شاید نمبروں کا ذخیرہ ان تک پہنچتے پہنچتے سمٹ گیا تھا۔ آپ نے حصولِ علم کے لیے بے پناہ ریاضت کی تھی۔ اس کا ثمر یہ ملا کہ آپ نے بعد میں ایم اے فلسفہ کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ اسی زمانے میں آپ نے ڈاکٹر رادھا کرشنن کے فلسفے پر عمدہ مقالہ تحریر کیا۔ مولانا اسلام کے علاوہ عیسائیت، ہندو مذہب اور فلسفۂ ویدانت سے واقف تھے۔ بدھ مت پر بھی گہری نظر تھی اور جدید فلسفہ اور علم الکلام سے بخوبی واقف تھے۔

جب آپ برسرِ روزگار ہوئے تو ان کے والدین کے دل میں مولانا کے سر پر سہرے کے پھول کھلانے کی آرزو بیدار ہوئی، لیکن اس میں اڑچن یہ آن پڑی کہ جن لڑکیوں کو ان کے والدین نے پسند کیا وہ مولانا کو نہ بھائیں اور جن پر مولانا لہلوٹ ہوئے وہ مولانا کو خاطر میں نہ لائیں۔ اس کش مکش میں ٹوٹ گیا رشتہ چاہ کا۔ خیر یہ بیان مولانا کا تھا ورنہ وہ ایسے کنوارے بھی نہ تھے۔ مولانا یوسف سلیم چشتی کے قریبی عزیز پروفیسر محمود بریلوی کا بیان تھا کہ مولانا نے پروفیسر بریلوی کی بہن سے شادی کی تھی لیکن بعد میں طلاق دے دی تھی۔

مجھے شاہ حسن عطا مرحوم نے بتایا کہ مولانا اپنی ایک عقیدت مند خاتون کو جو ان سے عمر میں بہت چھوٹی تھیں، خط لکھا کرتے تھے۔ ان میں فلسفے اور تصوف کے نکات دل کش ادبی پیرایے میں بیان کیے جاتے اور مخاطب خاتون میں حوروں کی صفات تلاش کی جاتیں۔ شاہ صاحب کا کہنا یہ تھا کہ اگر یہ خطوط منظرِ عام پر آجاتے تو رنگینیِ بیان اور دل آویزیِ زبان

کے اعتبار سے خطوطِ شبلی بنام عطیہ فیضی کے مانند ادبی دنیا میں نقشِ دوام چھوڑ جاتے۔ خط کے آخر میں مولانا اپنا نام اس انداز سے لکھتے ''مجموعۂ عیوب وزشتی یوسف سلیم چشتی۔''

ان کے والد نے ان کا نام محمد یوسف خاں رکھا تھا۔ مولانا نے جب وادیِ تصوف میں قدم رکھا اور حضرت سلیم چشتی سے ان کی عقیدت استوار ہوئی تو آپ نے اپنے نام میں ترمیم کر ڈالی۔ ان خطوط سے ایک بات ظاہر تھی مولانا محض علمی رجحان یا فلسفیانہ ذہن نہ رکھتے تھے، بلکہ پہلو میں دلِ بیدار بھی تھا جو حسینوں کی محفل میں مزید بیدار ہو جاتا۔

مولانا نے بتایا کہ انھوں نے ایک سال اکبرالہ آبادی کی صحبت میں بسر کیا تھا اور چودہ برس اقبال کے ساتھ رہے۔ اس ایک برس میں انھوں نے اکبر سے جو کچھ سیکھا، وہ اقبال کی چودہ برس کی محفلوں میں نہ حاصل کر پائے۔ مولانا نے اکبر سے فلسفہ اور تصوف کی تعلیم حاصل کی تھی۔ اکبرالہ آبادی خود بہت بڑے موحد تھے اور انھوں نے مولانا کے دل میں بھی توحید کی لو کو اکسایا۔ وہ تصوف سے نظری تعلق کو کافی نہ سمجھتے تھے بلکہ طریقِ حیات تصور کرتے تھے۔ ان کا تصوف شریعت کے تابع تھا، اس میں غیر اسلامی اجزا کی آمیزش نہ تھی۔ مولانا کے نزدیک اکبر محض اعلیٰ پایے کے شاعر نہ تھے، بلکہ بڑے درجے کے عالم اور مفکر بھی تھے۔ انھوں نے بنظرِ غائر مغربی تہذیب اور فلسفے کا مطالعہ کیا تھا اور طنز و مزاح کے پردے میں اس کے معائب بیان کیے تھے۔

میں نے ایک دفعہ مولانا سے عرض کیا کہ ''مولانا آپ کے یہاں ہمہ گیری یا versatility پائی جاتی ہے۔'' مولانا میری حقیقت شناسی اور سعادت مندی سے بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے، ''ہاں بھئی! میرا شروع سے یہی انداز رہا ہے۔ مجھے فلسفے کے علاوہ تاریخ، سیاسیات، اردو اور فارسی ادبیات سے دل چسپی رہی تھی۔'' میں نے عرض کیا کہ اسی ہمہ گیری کا کرشمہ ہے کہ آپ کلامِ اقبال کی شرح کے دوران مسلم ممالک میں مغرب زدگی اور تجدد کا قصہ لے بیٹھتے ہیں۔ حسنِ ازل کی تشریح کے دوران ترک خواتین عالمی مقابلۂ حسن میں شرکت کر لیتی ہیں۔ یہ سنتے ہی مولانا نے تیزی سے آنکھیں جھپکائیں اور موضوعِ گفتگو بدل دیا۔ درحقیقت مولانا کی تصانیف میں مختلف علوم سے واقفیت تو بھرپور ہوتی لیکن آپ کا

اندازِ تحریر جدید اور سائنٹیفک نہ تھا۔ اس پر قدامت کی گہری چھاپ تھی۔

مولانا میں جزرسی کنجوسی کی حد تک تھی لیکن کچھ دخل ان کی بے زری کا تھا۔ وہ ایک قانع اور متوکل انسان تھے۔ شام کو جب میں ان کے کلبۂ احزاں یعنی گھر پہنچتا تو پہلے سے وقت طے ہونے کے باوجود مولانا غائب ہوتے۔ ایک نقیب جو عموماً ان کا بھتیجا ہوتا آپ کے مرحلہ وار تیار ہونے کی اطلاع دے کر غائب ہو جاتا۔ میں دشتِ تنہائی میں دنیا کی بے ثباتی اور حیات بعد الممات کے مراحل پر غور کرتا رہتا۔ اردگرد کے ماحول کو دیکھنے کے بعد یہی مرغوب موضوعات ذہن میں کلبلاتے۔ خاصی دیر بعد مولانا تیار ہو کر باہر تشریف لاتے۔

گھر سے نکلنے کے بعد ہم کسی ریستوران کو آباد کرتے۔ ہماری محفلوں کی رونق صرف چائے تک محدود نہ تھی بلکہ میری جیب اور ان کی اشتہا اجازت دیتی تو اس میں اضافہ ہو جاتا۔ اس وقت مولانا کی گل افشانیِ گفتار دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ یادوں کے تھان کھلتے جاتے اور متنوع مشاہدات و واقعات سامنے آتے۔ ایسی ہی ایک محفل میں مولانا تحریکِ آزادی کے اکابر کی نالائقی پر ڈانٹ ڈپٹ کر رہے تھے۔ اتفاقاً ذکر اقبال کا آیا تو غصے کی جھونجھ میں اقبال بھی کلماتِ سخت کے مستحق ٹھہرے۔ میں نے عرض کیا کہ مولانا اقبال کو تو بخش دیجیے، وہ تو آپ کا ذریعۂ معاش ہیں۔ غصے کے یہ بادل بن برسے ٹلنے والے نہ تھے۔ جب ایک دفعہ برس گئے تو مطلع صاف تھا اور مولانا کا موڈ خوش گوار تھا۔

مزاج میں شدت پسندی کی ایک وجہ مولانا کا خلوص اور ذاتی محرومی تھی۔ انھیں اس امر کا احساس تھا کہ معاشرے نے ان کی خاطر خواہ قدر نہ کی۔ ان کی وسعتِ علم اور ذہانت کا احساس ان کے گزر جانے کے بعد ہوا۔ آپ انجمن ترقی پسند مصنفین کے سخت خلاف تھے۔ آپ کے نزدیک انجمن سے وابستہ شعرا اور ادیب غیروں کے نقیب، شرفا کے رقیب اور خباثت سے قریب تھے۔ ان کے جلسے جو ہر سال منعقد ہوتے دراصل موقع پرستوں کے لیے دعوتِ عام اور بدنامیِ دوام کے دربار تھے۔ انھوں نے ادب کو صحافت اور ایک مخصوص پارٹی کے پروپیگنڈے کی سطح پر پہنچا دیا تھا۔ ملک میں جو استحصالی اور غیر انسانی نظام تھا، اس میں حقیقی اہلِ علم کے پنپنے یا قدر دانیِ فن کی روایت باقی نہ رہی تھی۔ مقبولیت کے جو

سکّے معاشرے میں رائج تھے مثلاً مکرو فریب، خوشامد اور بے اصولی وغیرہ مولانا کا دامن ہمیشہ ان سے خالی رہا۔ تمام عمر آپ اکلِ حلال اور صدقِ مقال پر عامل رہے۔

ایک دفعہ آپ کے ساتھ ایک عقیدت مند کے گھر گیا۔ اس شخص کی رہائش ایک پرانی وضع کی عمارت کے ویران حصے میں تھی۔ یہ عمارت کسی زمانے میں بہت شان دار اور مضبوط ہوگی لیکن اس وقت مناسب دیکھ بھال نہ ہونے کے سبب خستہ و ویران تھی۔ ان صاحب نے ہمارا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ وہ مولانا کے سامنے اس طرح بچھا جا رہا تھا جیسے مرید مرشد کی خدمت کر رہا تھا۔ حسبِ توفیق اس نے ہماری تواضع کی۔ کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد ہم نے رخصت چاہی اور صدر کی سیر کرنے لگے۔

مولانا نے بتایا کہ اس شخص کے دادا نے یہ عمارت بنوائی تھی اور اولاد کے نام اسے وقف کر دیا تھا۔ زمانے کے الٹ پھیر نے اس آدمی کو ان حالوں میں پہنچا دیا کہ وہ نہ تو عمارت کی مرمت کرا پاتا اور نہ اسے بیچ کر موزوں رہائش اختیار کرسکتا تھا۔ لاہور کے بے شمار مسلمان جائیداد کے مقدموں میں برباد ہوگئے۔ جائیداد کی مالیت سے کہیں زیادہ رقم وہ وکیلوں کی فیسوں اور دیگر اخراجات میں پھونک چکے تھے۔ مولانا حساس اور درد مند دل کے مالک تھے، انھیں مسلمانوں کی عمومی پستی اور اخلاقی بحران سے بہت دکھ پہنچتا۔ مذہبیت کے باوجود مولانا میں فرقہ وارانہ تعصب نام کو نہ تھا اور نہ ہی تنگ نظری تھی۔

وقت گزرنے کے ساتھ مراسم بڑھتے گئے۔ ان کا مزاج شعلہ وشبنم کا امتزاج تھا ان کا خلوص دیرپا لیکن غصہ وقتی ہوتا۔ مزاج آشنا ہونے کے بعد میرا بھی حوصلہ بڑھا۔ مشکل یہ تھی کہ جو کچھ دل میں ہوتا فوراً زبان پر آجاتا۔ دل و زبان کے درمیان ذہن کا جنکشن نہ تھا جو بات کو راست فکری کی پٹڑی پر لے آتا۔ اب یہ ضروری نہ تھا کہ جو کچھ زبان پر آیا ہو وہ سامع کے لیے خوش گوار بھی ہو، چناں چہ گفتگو کے دوران کبھی کبھی مولانا کی ناراضی مول لینی پڑتی، لیکن یہ کیفیت عارضی ہوتی۔ کچھ دیر بعد مولانا معمول کے مطابق باتیں کرنے لگتے۔ ابتدا میں ان کے بدلتے موڈ پریشان کن تھے لیکن پھر:

مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہوگئیں

مولانا علوم و فنون میں کمال حاصل کرنے کے لیے طبعی موزونیت پر بہت زور دیتے تھے۔ ان کے نزدیک ریاضت سے کسی فن کے مبادی سے آگہی تو ممکن تھی لیکن حصولِ کمال کے لیے طبعِ موزوں ہی کام آتی۔ اس ضمن میں انھوں نے اپنے ایک عزیز کی مثال دی۔ یہ صاحب برسوں موسیقی کا ریاض کرتے رہے۔ محنت سے کلاسیکی موسیقی کے رمز آشنا تو ہو گئے لیکن خود سے گانے پر قادر نہ تھے بے سرا پن فوراً ظاہر ہو جاتا۔

ایک دفعہ جب میں ان کے گھر گیا تو آپ کراچی میں گرما کی تعطیلات گزارنے کے بعد واپس لاہور جا رہے تھے۔ کینٹ اسٹیشن گھر سے قریب تھا۔ مولانا کے بھتیجے ان کی واپسی کی خوشی میں جلوس کی شکل میں مولانا کو رخصت کرنے اسٹیشن تک آئے۔ میں بھی ان خوش جمال و خوش خصال لڑکوں کے ساتھ تھا۔ ٹرین کی روانگی میں دیر تھی۔ ہم لوگ مولانا کے کوپے میں تھے کہ مولانا نے اپنے سامان کی زیارت کرائی۔ کوئی چیز بھی دس پندرہ سال سے کم پرانی نہ تھی۔ میں نے عرض کیا کہ مولانا یہ اشیا تو آپ کی زندگی ہی میں عجائب گھر کے لائق ہو چکی تھیں۔ آپ یہ سن کر مسکرا دیے۔

میں نے ایک دفعہ مولانا سے عرض کیا کہ اقبال کی تصنیف Reconstruction of Religious Thought in Islam کو سمجھنا بہت دشوار ہے۔ مولانا نے اس کے متعلق فرمایا کہ ''اگر عباسیوں کے عہد میں یہ کتاب شائع ہوتی تو اسلامی دنیا میں فکری انقلاب برپا کر دیتی، لیکن برصغیر کے مسلمانوں نے اسے بہت کم پڑھا اور استفادہ کیا۔ مجھے موقع نہیں ملا ورنہ میں اس کی بھی شرح لکھتا۔'' مولانا تصانیفِ اقبال میں ''جاوید نامہ''، ''زبورِ عجم'' اور ''بالِ جبریل'' کے بہت مداح تھے۔ آپ ''مسجدِ قرطبہ'' کو اقبال کا لافانی شاہکار قرار دیتے تھے۔

پروفیسر چشتی ہندوستان میں مولانا فضلِ حق خیر آبادی کے مکتبِ فکر کے بہت معترف تھے اور اسی نسبت سے کلیۂ اسلامیات کے سربراہ سیّد منتخب الحق کے عقیدت مند تھے۔ آپ فرماتے تھے کہ مولانا منتخب الحق اس مکتبۂ فکر کی آخری کڑی تھے۔ ان کا تمام علم منقولی تھا، انھوں نے تحریری سرمایہ نہ چھوڑا تھا۔ اسی طرح آپ بشیر احمد ڈار کے علم و فضل

اور اقبال شناسی کے قائل تھے۔ آپ نے ڈار صاحب کی ایک تصنیف کے متعلق فرمایا کہ اگر میرے امکان میں ہوتا تو محض اس کتاب کی تصنیف پر انھیں فلسفے میں ڈاکٹریٹ کی سند عطا کر دیتا۔ جب آپ ڈار صاحب کو عالمِ تخیل میں علمی اعزاز سے نواز رہے تھے تو انھوں نے خود کو نہ جانے علم وفن کے کس مقامِ بلند پر فائز پایا ہوگا۔

فلسفہ اور علم الکلام سے اس قدر شغف کے باوجود ان میں فلسفیوں کی سی خشک مزاجی اور یبوست نہ تھی، بلکہ جذباتی جوار بھاٹے کے باوصف ان کی گفتگو خاصی دل چسپ ہوتی۔ وہ بہت اچھے متکلم تھے اور مخاطب کی علمی استعداد اور میلانِ طبع کے مطابق گفتگو کرتے۔ باتوں کے دوران ان کے موڈ بدلتے رہتے۔ کبھی مہر کا چشمہ ابلتا تو کبھی قہر کے کوڑے برسنے لگتے۔ ان جذباتی انتہاؤں کے درمیان علم وحکمت کا چشمۂ صافی بہتا رہتا۔ ان کا بے پایاں خلوص ان کی شدت پسندی کا مداوا کر دیتا۔

مولانا اپنی رائے کے اظہار میں بے باک اور مصلحت نااندیش تھے۔ اس کی وجہ ان کی دنیا سے بے نیازی تھی۔ ایک دفعہ آپ، کراچی کے مرکز الاسلامی میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے غالی عقیدت مندوں کے درمیان تقریر کر رہے تھے۔ آپ نے فرمایا کہ شیخ عبدالقادرؒ نے جس قدر توحیدِ خالص پر زور دیا تھا، اسی قدر آپ کے نام لیوا شرک اور بدعت میں گرفتار تھے اور انھوں نے اپنے اعمال سے شیخ کی تعلیمات کے چشمۂ صافی کو گدلا کر دیا تھا۔ ان کی تعلیمات تصورِ توحید اور اتباعِ شریعت کے تابع تھیں۔

مولانا سے گفتگو کے دوران آپ کی رائے میں شدت اور حدت کا احساس ابھرتا تھا۔ اس میں جب بدزبانی کا اضافہ ہوتا تو خاصی وحشت ہوتی۔ مولانا پاکستان میں جن اقدار کی بالادستی چاہتے تھے اور گرد وپیش میں منافقت اور دین بیزاری کا غلبہ دیکھتے تو اس کا ردِعمل ان کی باتوں سے جھلکتا تھا۔

اپریل ۱۹۶۹ء میں، میں لاہور گیا تو ان کی قیام گاہ پر حاضری دی۔ آپ مرکزِ شہر میں ایک پرانی طرز کی بلڈنگ میں ایک یا دو کمروں کے فلیٹ میں مقیم تھے۔ رہائش بہت سادہ اور دل دولتِ دنیا سے مستغنی تھا۔ ظاہری سامانِ آرائش کا نام ونشان تک نہ تھا۔ مجھے

اچانک سامنے دیکھ کر بہ یک وقت حیران اور خوش ہوئے۔ جمعہ کی نماز کا وقت تنگ ہو رہا تھا۔ انھیں قریبی مسجد میں جمعہ کا خطبہ دینا تھا اس لیے عجلت میں تھے۔ چند منٹ دروازے پر باتیں کیں۔ پھر وارفتہ و آزاد پائینچوں کو گرفتار کیا، یعنی انھیں سمیٹ کر شکنجے میں کسا۔ سائیکل پر سوار ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے اوجھل ہوگئے۔

اس وقت تو احساس بھی نہ تھا کہ عالمِ امکاں میں یہ آخری ملاقات تھی لیکن اب احساسِ زیاں کے ساتھ حافظے کی سطح پر ایک سین ابھرتا ہے۔ ڈاکٹر ''ژواگو'' نامی فلم میں ژواگو اور اس کی محبوبہ لارا ریاستی جبر کی بنا پر ایک دوسرے سے جدا ہوگئے تھے۔ یہ سین ذہن کی سطح پر یوں ابھرا کہ اب کہیں بھی ان جیسے مخلص اور بے ریا عالم نظر نہیں آتے۔

مولانا سے میرے روابط چار پانچ برس رہے، پھر میل جول کے مواقع نہ ملے۔ برسوں بعد غالباً ۱۹۸۲ء یا ۱۹۸۳ء میں پتا چلا کہ مولانا نے برسوں کی محنت کے بعد اسلامی تصوف کی تاریخ لکھی جو حکومت نے ضبط کر لی۔ میں نے یہ کتاب پوری نہ پڑھی لیکن اس کا کچھ حصہ میری نظر سے گزرا۔ مولانا کی یہ کتاب ان کا Magnum Opus تھی۔ زندگی بھر کے مطالعے کا نچوڑ یہ تصنیف تھی۔ آپ نے تاریخِ تصوف میں عجمی اور ہندی تصوف کی پیوند کاری کی نشان دہی کی تھی اور عربی و فارسی ماخذات کی مدد سے غیر اسلامی تصورات واضح کیے تھے۔ آپ اسلامی تصوف کو شریعت کے تابع تصور کرتے تھے۔ توحید پر اس قدر زور دیتے تھے کہ ان کے نزدیک شرک کی کوئی بھی شکل ناقابلِ قبول تھی۔ کاش مولانا کی کتاب ضبط کرنے کے بجائے ان کے افکار سمجھنے کی کوشش کی جاتی۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔

(پیر، ۱۵ر مارچ ۲۰۱۰ء)